# مفردات قرآن کو سمجھنے کے بنیادی اصول اور تفسیر میں ان کا کردار

## علامہ طباطبائی کی نظر میں

امیر رضا اشرفی[1]

مترجم: سید حسنین عباس گردیزی

hasnain.gardezi@gmail.com

**کلیدی کلمات:** مفردات قرآن، مفردات کو سمجھنے کے بنیادی اصول، الفاظ کے معانی میں تبدیلی، عربی میں داخل ہونے والے غیر عربی الفاظ (اجنبی الفاظ) تفسیر المیزان، علامہ طباطبائی۔

**خلاصہ**

تفسیر قرآن کے عمل (Process) میں قرآن کے الفاظ کو سمجھنے کی کیفیت قواعد وضوابط کے تابع ہے اور خاص اصولوں کی بنیاد پر ہی معانی کو حاصل کیا جاتا ہے۔ اس مقالے میں تفسیر المیزان کی عبارات کا تجزیہ و تحلیل اور ان میں تحقیق و جستجو کرکے مفردات قرآن کو سمجھنے کے بنیادی اصولوں کو علامہ طباطبائی کی نظر میں اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے نیز تفسیر قرآن میں اس کے اثرات کا موصوف کی نگاہ میں جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق: (۱) مفردات (الفاظ) قرآن کے مصادیق کی خصوصیات ان کے موضوع لہ (لغوی معنی) سے خارج ہیں۔ اس بات سے ایک لفظ کا ظاہری طور پر مختلف اور متعدد مصادیق پر حقیقی اطلاق ممکن ہو جاتا ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی صفات اور عالم آخرت سے مربوط آیات میں قرآنی الفاظ زیادہ تر ماورائے مادہ اور انتہائی اعلیٰ مصادیق کے لئے استعمال ہوئے ہیں، اس لحاظ سے ان الفاظ کے رائج اور عمومی مصادیق اور معانی مفسر کی ذہنی توجہ ان اعلیٰ وارفع معانی اور مصادیق سے ہٹنے کا باعث نہ بنیں۔ (۳) وقت کے گزرنے کے ساتھ بعض الفاظ کے معانی میں تبدیلی اور تحویل پیدا ہوا ہے اس کی وجہ سے قرآن کی رو سے ان کے معانی عربوں میں رائج اور متداول معانی سے مختلف ہیں۔ اس قسم کے مفردات (الفاظ) کو صحیح سمجھنے کا معیار عصر نزول میں ان کا مروجہ استعمال ہے۔ (۴) قرآن کی اصطلاح میں بعض الفاظ کو خاص معانی پہنائے گئے ہیں، قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے ان کی طرف خاص توجہ رہنی چاہیے۔ (۵) بہت سارے غیر عربی الفاظ نے عربی زبان میں داخل ہو کر نئے معانی اخذ کئے ہیں اس قسم کے الفاظ جس کو اصطلاح میں الفاظ معربہ کہا جاتا ہے، کے معانی کو جاننے کے لئے ان کے عربی زبان اور ادبیات میں استعمال کو مدّ نظر رکھنا چاہیے۔

## مقدمہ

قرآن مجید کی آیات عربی زبان میں عبارات اور جملات کا مجموعہ ہیں۔ قرآن کی عبارتیں اور جملے چھوٹی اکائیوں سے تشکیل پاتے ہیں، جنہیں الفاظ اور کلمات کہا جاتا ہے۔ ایک اصطلاح کے مطابق انہیں مفردات قرآن کا نام دیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے بارے میں بنیادی سوالات میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کے مفردات، معنی کے لحاظ سے کن خصوصیات کے حامل ہیں، ان کے تشکیل پانے کا دائرہ کیا ہے اور کن اصول وضوابط کی بنیاد پر ان کے معانی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ (1)

مفردات قرآن کے معانی کو سمجھنے کے بنیادی اصولوں کو بیان کرنا اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ ان اخذ شدہ اصول وضوابط کے بنیاد پر قرآن کے الفاظ کے معانی کو باقاعدہ اور منظّم انداز سے سمجھا جاسکتا ہے اور اس طرح سے درست اصولوں کو اپنا کر آیات کی تفسیر میں خطا اور غلطی سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ ہر ایک مفسر نے خاص قواعد اور اصولوں کی بنیاد پر مفردات قرآن کے مفاہیم کو بیان کیا ہے۔ اس مقالے میں ہماری تحقیق کا موضوع بلند پایہ اور جامع تفسیر المیزان میں مفردات قرآن کو سمجھنے کے لئے علامہ طباطبائیؒ کے اصول ومبانی ہیں۔ اس مقالے سے پہلے ہمیں ایسی کوئی تحقیق یا تحریر نہیں ملی جس میں مذکورہ موضوع پر بحث کی گئی ہو۔

مفردات قرآن کے معنی اور مدلول سے متعلق اصولوں کو جاننے کے لئے ان الفاظ کے اصلی عناصر کو دیکھنا ہوگا۔ الفاظ کے مفردات میں چند عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو کہ درج ذیل ہیں:

الف: الفاظ　　　　ب: الفاظ کے معانی

---

1۔ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تفسیر وعلوم القرآن، موسسہ پروہشی امام خمینیؒ قم

ج: مصادیق د: الفاظ کے معانی پر دلالت کی نوعیت۔

الفاظ قرآن کے مفاہیم کو سمجھنے کے لئے علامہ کے بنیادی اصول و قواعد کو حاصل کرنے کے لئے ہم صرف درج ذیل سوالوں پر علامہ طباطبائی کی نظر میں بحث کریں گے اور ہر ایک سوال کے بارے میں ان کے نظریے کا تجزیہ و تحلیل کریں گے۔

ا۔ کیا مفردات قرآن کے مصادیق کی خصوصیات کا ان کے لغوی معنی (موضوع لہ) میں عمل دخل ہے؟

۲۔ کیا مفردات قرآن کے مصادیق وہی مروجہ اور متعارف مصادیق ہیں؟

۳۔ کیا قرآن میں استعمال ہونے والے الفاظ کے اصلی معانی اپنی جگہ محفوظ میں یا یہ کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ لوگوں کے درمیان ان کے معانی رفتہ رفتہ تبدیل ہوگئے ہیں؟

۴۔ کیا قرآن میں استعمال ہونے والے معربہ الفاظ نے اپنی سابقہ اور اصلی زبان کے معانی کو محفوظ رکھا ہے یا یہ کہ قرآن اور عربی زبان میں استعمال سے انہوں نے نئے معانی زیب تن کیے ہیں؟

## 1۔ موضوع لہ سے مصداق کی خصوصیت کا خارج ہونا

علامہ طباطبائی کا نظریہ ہے کہ مسمیات پر اسامی کے اطلاق میں مصادیق کی خصوصیات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ان کی نگاہ میں سخن اور کلام کی پیدائش کا فلسفہ اجتماعی زندگی میں بشری ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ یہ عامل اس بات کا باعث بنا کہ انسان اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مطلوبہ معانی کے لئے الفاظ قرار دے اور اس ذریعے سے اپنے مافی الضمیر کا دوسروں کے سامنے اظہار کرسکے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ الفاظ کا معانی کے لئے وضع ہونے کے اس عامل کا دارومدار اس استعمال پر ہے جو انسانی زندگی میں اس کے مصداق سے تقاضا کرتا ہے (2) باالفاظ دیگر اسامی اور الفاظ کی وضع اور اس کے استعمال کا میعار وہ غرض اور فائدہ ہے جو اس کے خارجی مصادیق سے انسان کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ اس کے ابتدائی مصادیق کی خصوصیات اور صفات۔ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں۔

جس چیز نے ہمیں الفاظ کو بنانے اور تراشنے پر مجبور کیا وہ افہام و تفہیم کی معاشرتی ضرورت ہے۔ ہمیں اس لحاظ سے معاشرے سے روبرو ہونا پڑتا ہے کہ اس ذریعے سے مادی امور سے متعلق کاموں کو انجام دے کر نقص سے کمال تک پہنچیں۔ پس ہم الفاظ کو مسمّیات کے لئے علامتیں قرار دیتے ہیں جن سے ہمارے خاص مقاصد اور غرض وغایت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اسم (لفظ) کے اطلاق اور صادق آنے کا معیار مصداق کا (مورد نظر) غرض وغایت پر مشتمل ہونا ہے نہ کہ اس کا خارجی مصادیق کی شکل وصورت پر قائم اور موجود ہونا معیار ہے۔ (3)

علامہ نے مفردات قرآن کے بارے میں اسی نظریے کو بنیاد بنایا ہے اور ان کی رائے ہے کہ مصادیق کی خصوصیات کا ان کے نام رکھنے میں عمل دخل نہیں ہے۔ علامہ سے پہلے بھی بعض محققین قرآن نے یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ (4)

الفاظ کے بنانے (وضع) اور ان کے استدلال کے باب میں مذکورہ نظریہ کا قرآن کے الفاظ اور اسی طرح آیات وعبارات سے مطالب اور مفاہیم کو اخذ کرنے کے علامہ کے اسلوب پر گہرا اثر ہے اور شاید اسے بہت سارے مفردات قرآن کے مفاہیم کو سمجھنے کے لئے تفسیر المیزان کی بنیادی کلیدیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے علامہ نے متعدد مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے تفسیری مفاہیم کی بنیاد اسی اصول اور نظریے کو قرار دیا ہے (5)۔ اب ہم اس نظریے اور اصول کے مختلف زاویوں کو بیان کرتے ہیں۔

### الف: مصادیق میں تبدیلی اور ایک لفظ کا تمام مصادیق پر حقیقی اطلاق

علامہ اپنے نظریے کے ایک زوایے کو بیان کرتے ہیں کہ الفاظ ومفردات کے اپنے معانی کے مصادیق سے تعلق کے باب میں زمانے کے ساتھ مصادیق میں دائمی تبدیلی ہوتی ہے اور وہ اس بات کے قائل ہیں کہ وقت کے ساتھ مصادیق میں تبدیلی کے باوجود وہی اسماء اور الفاظ اپنے

نئے مصادیق پر حقیقی طور پر اطلاق ہوتے ہیں، کیونکہ مصادیق کی خصوصیات معانی (موضوع لہ) میں دخالت نہیں رکھتیں اور جدید مصادیق میں اغراض ومقاصد باقی ہوتے ہیں۔ مثلاً سراج (چراغ) کا لفظ شروع میں ایک روشنی کے لئے استعمال ہونے والے آلے کے لئے بنایا گیا جو خاص مواد اور شکل پر مشتمل تھا، لیکن چونکہ نام رکھنے کا معیار اغراض ومقاصد ہیں اس لئے آج کے جدید آلات جو جدید ساخت اور شکل اختیار کر چکے ہیں ان کا اصلی مواد بھی تبدیل ہو چکا ہے اس کے باوجود وہی روشنی اور نورافشانی کا کام دیتے ہیں تو یہ لفظ ان پر حقیقی طور پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ قابلیت اور اہلیت اس بات کا سبب بنی کہ وہ الفاظ جو ابتداء میں محسوس معانی کے لئے ہوتے ے تھے انہیں معقول (غیر مادی اور غیر محسوس) معانی اور مصادیق میں مجاز گوئی کے بغیر استعمال کیا جاسکے۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ (6)

اس بنیادی اصول کا ایک اور نمونہ لفظ اسلحہ کا استعمال ہے۔ اسلحہ کا لفظ اصل میں دفاع اور حملے کے لئے ہتھیاروں کے لئے وضع ہوا ہے۔ لیکن یہ اسلحے کی تمام انواع واقسام، پہلے زمانے کے قدیمی اور ابتدائی اسلحوں سے لے کر آج کل کے جدید ترین ہتھیاروں پر (مجاز اور تاویل کے بغیر) بطور مساوی منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلحہ کا حقیقی اور موضوع لہ معنی وہی ہتھیار اور آلہ ہے جو جنگوں میں دفاع یا حملے کے لئے بروئے کار لایا جاتا ہے اور اس لفظ کے ہر دور اور ہر زمانے کے مصادیق کی خصوصیات اس کے موضوع لہ میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ (7)

**ب: حقیقی معنی میں وسعت کا امکان**

علامہ طباطبائی کے نظریے کا ایک لازمہ الفاظ کے استعمال میں وسعت اور ان کا وسیع تر معانی اور مصادیق میں استعمال (جیسا کہ گذشتہ دو مثالوں سراج اور اسلحہ کے الفاظ میں دیکھا گیا ہے) ان کے ابتدائی معانی اور مصادیق میں سے ہونے کا امکان ہے۔ یہ وسعت اور پھیلاؤ وقت کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کی مختلف خصوصیات کے ساتھ اپنے مصادیق میں بطور حقیقی استعمال کے لئے زمین ہموار کرسکتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی زمانے میں ایک ہی لفظ کا متعدد اور بظاہر مختلف مصادیق میں استعمال کا بھی موقعہ فراہم ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے استعمال کی مثال لفظ ''سؤال'' ہے۔ اس لفظ کا اپنے اصلی معنی کے لحاظ سے استعمال بہت وسیع ہے۔ اس لفظ کا ابتدائی اور واضح عام اور معمولی استعمال ''زبانی سوال'' ہے البتہ اس کے علاوہ معانی میں بھی بطور حقیقی استعمال کا امکان ہے۔

مذکورہ لفظ اپنے اصلی معنی (کہ جس میں مصادیق کی خصوصیات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا) کے طور پر ہر قسم کی طلب اور مانگنے پر اطلاق کے قابل ہے۔ اس لحاظ سے تمام مخلوقات جو خلقت اور تکوین کے اعتبار سے غنی علی الاطلاق کی محتاج ہیں اور طبعیت کی زبان میں اپنی ضروریات اور احتیاجات کو اس سے طلب کررہی ہیں انہیں بھی بطور حقیقی اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے والی (مخلوق) کہا جاسکتا ہے۔

علامہ اس بارے میں لکھتے ہیں: سوال کا مطلب طلب کرنا (درخواست کرنا) ہے اور انسان اپنی ضروریات کے اعتبار سے اس ذات سے مانگتا اور درخواست کرتا ہے جو اس کی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے۔ سوال کا عام اور معمولی معنی وہی زبانی اور لفظی مانگنا ہے۔ البتہ اشارے اور خط کی صورت میں بھی سوال انجام پاسکتا ہے۔ یہاں بھی سوال حقیقی معنوں میں ہے۔ نہ کہ مجازی معنی میں، چونکہ ہر محتاج اور ضرورت مند کی احتیاج کو اللہ تعالیٰ ہی برطرف کرنے والا ہے اور کوئی بھی موجود اپنی ذات وجود اور بقاء میں اپنے سے وابستہ اور قائم نہیں ہے اور اس کے پاس جو کچھ ہے اسی کا جود وکرم ہے۔۔ ہر کوئی محتاج، گدا اور سائل ہے جو اپنی ضروریات اور حاجات کو اس کی بارگاہ سے مانگتا اور طلب کرتا ہے۔ سوال کی حقیقت اور حق یہی ہے کہ یہ (درخواست) ذات باری تعالیٰ سے مختص ہے اور اس کے غیر سے اس قسم کا سوال قابل تصور نہیں ہے۔ سوال کی دوسری قسم زبانی سوال ہے جس کے ذریعے کبھی اس سے اور کبھی اس کے غیر سے مانگا جاتا ہے اللہ تعالیٰ ہی ایک ایسا مسؤل ہے کہ تمام موجودات بطور حقیقت بھی اس سے طلب گار ہیں اور بعض لوگ (مومنین) زبان کے ذریعے اس سے طلب حاجت کرتے ہیں۔ (8)

مذکورہ اصول کے استعمال کا ایک اور نمونہ لفظ کلام یا تکلم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لفظ کے بہت سارے مصداق ہیں بنی نوع انسان کے درمیان اس کے مروجہ اور عام مصادیق زبان کے لوتھڑے، منہ، لبوں سے بات (کلام) کرنا اور حروف کو مخارج سے نکالنا ہے جس کی غرض وغایت پیغام کو واضح انداز میں مخاطبین تک پہنچانا ہے۔

بات (کلام) کرنے کا ایک اور مصداق بھی ہوسکتا ہے جس سے وہی غرض وغایت حاصل ہوتی ہے، لیکن اس میں مادی خصوصیات کا عمل دخل نہیں ہوتا؛ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے کلام کرنا یا اللہ تعالیٰ کا انبیاء سے بلاواسطہ گفتگو کرنا، اس قسم کے کلام (بات) کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پیغام اس کے پیغمبر تک منتقل ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ مادہ سے ماوراء اور جسم وجسمانیت سے منزہ ہے، اس لحاظ سے اس کے کلام کرنے میں مادی مصادیق کی خصوصیات قطعاً موجود نہیں ہوتیں۔ مفردات کی نامگذاری کے حوالے سے جو اصول بیان کیا گیا ہے(9) اس کے پیش نظر، اس قسم کے کلام اور گفتگو کرنے پر بھی تکلم کا اطلاق بطور حقیقت ہوتا ہے۔ علامہ طباطبائی اس بارے میں فرماتے ہیں:

جس طرح سے انسان کلام اور گفتگو کرتا ہے (یعنی جو کچھ انسان کے ضمیر اور ذہن میں ہوتا ہے اسے قواعد وضوابط کے تحت مرکب آوازوں کے ذریعے سمجھانا) اس طرح اللہ تعالیٰ سے کلام سرزد نہیں ہوتا یعنی اللہ تعالیٰ کا گلہ نہیں ہے کہ اس سے آواز سنائی دے، اس کا دہن (منہ) نہیں ہے کہ آواز کو اس میں گھمائے اور الفاظ کی شکل میں لائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ومنزہ ہے کہ اعضاء جسمانی کی اُسے ضرورت ہو اور وہ اپنے خیالات کو وجود عطا کرے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (شوریٰ:11)

اگرچہ قرآن مجید مروجہ معنی میں تکلم کی اللہ تعالیٰ سے نفی فرماتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربّ العزت ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ۔ (شوریٰ:51)

ترجمہ: "اور ہر بشر کی (یہ) مجال نہیں کہ اللہ اس سے (براہِ راست) کلام کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعے (کسی کو شانِ نبوت سے سرفراز فرمادے) یا پردے کے پیچھے سے (بات کرے جیسے موسٰی علیہ السلام سے طورِ سینا پر کی) یا کسی فرشتے کو فرستادہ بنا کر بھیجے اور وہ اُس کے اِذن سے جو اللہ چاہے وحی کرے (الغرض عالمِ بشریت کے لئے خطابِ اِلٰہی کا واسطہ اور وسیلہ صرف نبی اور رسول ہی ہوگا)، بیشک وہ بلند مرتبہ بڑی حکمت والا ہے"

لیکن یہ آیہ مجیدہ تکلم کے حقیقی معنی کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتی ہے۔ اور یہاں لوگوں کے درمیان کلام کے عام اور رائج معنی کی اللہ تعالیٰ سے نفی کی گئی ہے پس کلام (بات کرنے) کا عام اور رائج معنی اللہ تعالیٰ سے منتفی ہے لیکن کلام کے خواص اور اثرات اس کے لئے ثابت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا مقصود اور مطلب اپنے نبی کو سمجھاتا اور بتاتا ہے اور یہ وہی کلام و تکلم کی حقیقت ہے یعنی اپنے مقصود اور مطلب کو دوسروں کو سمجھانا اور سننے والے کو ذہن میں ڈالنا ہے۔(10)

اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ "مالک" کا استعمال بھی اسی قبیل سے ہے۔ معاشرے میں مالکیت سے مراد خاص قسم کا اختصاص اور ایک چیز کا دوسری سے وابستہ ہونا ہے، جس کی وجہ سے مالک اپنی ملک میں اپنے تصرفات (استعمالات) کو جائز سمجھتا ہے۔ انسانی معاشرے میں مالک اور مالکیت کے الفاظ عام طور پر اعتباری امور میں بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں حقیقی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے؛ کیونکہ اس کا اصلی اور حقیقی معنی اللہ تعالیٰ پر ہی صدق کرتا ہے، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ انسانی معاشرے میں اس کا مصداق اعتباری مالکیتیں ہوتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا مصداق حقیقی مالکیت اور اصلی طور پر ہوتا ہے۔(11)

یہ اصول بالخصوص اللہ تعالیٰ کی صفات کو سمجھنے کے لئے قابل توجہ حد تک اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ انہی رائج اور عام معنوں میں مخاطبین کے ذہنوں میں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی ان کا مقصد اور اثر وہی حاصل ہوتا ہے جو عام

طور پر ان کے استعمال سے حاصل ہوتا ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کا مصداق اور ہوتا ہے اور دوسروں کے بارے میں مصداق اور۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہر عیب اور نقص سے پاک ومنزہ ہے۔ لہٰذا اس کی صفت بھی مخلوقات کے عیوب ونقائص سے خالی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب لفظ علم کو اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو حقیقیت میں یہ وہی مفہوم دیتا ہے جیسا اسے اس کے غیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر چیز کا عالم ہے۔ یہ جملہ ہم سب کے لئے ایک واضح معنی دیتا ہے مثلاً اس کا اس جملے "اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے" کے ساتھ واضح فرق ہے۔ چونکہ اس کی کامل واکمل اور بے مثال ذات اس کے ذاتی علم کا سرچشمہ ہے اس لئے وہ مادی خصوصیات اور محدودیت سے مبّرا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ کے وضع کے طریقہ کار اور ان کے استعمال کے پیش نظر ان کے الفاظ کے اصلی معانی وہی ہوتے ہیں جو اسم اور لفظ کے باقی رہنے سے باقی رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مصادیق اور خصوصیات مختلف ہوتی ہیں۔ الفاظ کے اصلی معانی کا خارجی مصادیق کی خصوصیات اور قیود سے (جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے) الگ اور جدا ہونا، لغات میں استعمال میں وسعت کا موجب بنتا ہے اور متنوع و مختلف مصادیق پر ان کا اطلاق حقیقی طور پر میسر آتا ہے۔(12)

### مفردات کو سمجھنے میں سائنس علمی اور فلسفی نظریات کا موثر نہ ہونا

بعض افراد ہرمنوتیک فلسفی میں پیش کردہ نظریات سے متاثر ہو کر دینی متون کے فہم وادراک کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں کہ خواہ نہ خواہ اس کا سرا فہم وادراک اور تفسیر کی نسبیت سے جاملتا ہے۔ جس کا نتیجہ قرآن اور دیگر دینی متون کے فہم وادراک کے معتبر اور مطمئن راستے کی بندش اور عدم دستیابی ہے۔ ان میں ایک فرد اپنے نظریے کو یوں بیان کرتا ہے:

سائنسی اور فلسفی نظریات نہ صرف تصدیقات دینی کو سمجھنے میں اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ شریعت میں تصورات اور مفردات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور انہیں معنی اور مفہوم عطا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص جب قرآن میں پڑھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کی قسم کھائی ہے تو اگر وہ پانچویں صدی ہجری کا ہے تو اس مطلب کو یوں سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چمکنے والے کرّے کی قسم کھائی ہے جو زمین کے گرد چکر لگاتا ہے اور اس کا حجم کرّہ زمین سے 160 گنا بڑا ہے؛ لیکن اگر وہ موجودہ صدی کا ہے اور جدید علم سے آگاہی رکھتا ہے تو وہ آیت کو اس طرح سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم کرّے کی قسم کھائی ہے جو گیسوں کا مجموعہ ہے اس کا درجہ حرارت 2 کروڑ درجہ ہے اور ایک ایٹم کے مرکز کی مانند ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ سائنسی اور فلسفی افکار ایک دم ان الفاظ اور مفردات کو تازہ معانی بخشتے ہیں اور جو شخص بھی فلسفہ اور خاص علم سے بہرہ مند ہے وہ کبھی بھی ان مفردات کا اپنے علم ودانش سے ہٹ کر معنی نہیں کرے گا اس کا فہم وادراک اپنے علم وافکار کے مطابق ہوگا۔(13)

بہت سارے مسلم فکرین نے "نظریہ" قبض وبسط" کو خالص دینی افکار سے متعارض پایا ہے اور مختلف حوالوں سے اس کی بنیادوں پر تنقید اور اعتراضات کیے ہیں اور اس نظریے سے نکلنے والے نتائج پر بحث کی ہے۔(14) علامہ طباطبائیؒ کی آراء کی روشنی میں جو بات یہاں کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ الفاظ کے وضع کے بارے میں علامہ طباطبائیؒ کے نظریے کی بنیاد پر (جس کے حق میں بہت ساری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔(15)

نظریہ قبض وبسط کا ایک ستون اور پایہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کے قائل شخص سے پوچھا جاسکتا ہے کیا واقعاً ایسا ہے کہ بولنے والا جب اس جملے "سورج ابھی تک افق پر دکھائی دے رہا ہے" میں لفظ سورج کو استعمال کرتا ہے تو موضوع لہ (سورج) کی ان تمام یا اہم ترین خصوصیات جو سائنسی طور پر ثابت ہو چکی ہیں، کو ملحوظ رکھتا ہے اور لفظ کی ان خصوصیات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اُسے مطلوب معنی میں استعمال کرتا ہے اور اس لفظ سورج کے سننے سے مخاطبین کے ذہن میں بھی یہ تمام خصوصیات متصور ہوتی ہیں؟ بالفرض اگر سورج کے حوالے سے ایک نیا نظریہ وجود میں آجائے کہ سورج جلنے کا سرچشمہ ہے اور وہ موجودہ نظریہ کی جگہ لے لے تو کیا اس لفظ سورج کو استعمال کرنے والے اُسے مجازی طور پر جدید معنی

میں بروئے کار لائیں گے اور اگر مذکورہ جملے کو جدید نظریات کی بنیاد پر بیان کرنا چاہیں تو کیا وہ قرینے سے استفادہ کریں گے؟ کیا اس بات کو قبول کیا جاسکتا ہے جدید نظریات نے لفظ سورج کے موضوع لہ کو تبدیل کر دیا ہے اور ہم سورج کے بارے میں جو آج معلومات رکھتے ہیں، ان کے ساتھ سورج کو نئے اور تازہ معنی میں استعمال کریں گے، اگرچہ اس کے متعلق ہمیں جدید اور دقیق معلومات حاصل ہیں؟ اس نظریے پر محققین نے تفصیل سے تنقید کی ہے یہاں پر اُسے بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے؟ (16)

**د۔ عصر نزول کے ماحول کے اثرات کے بغیر الفاظ کے استعمال کا امکان**

مسمیات کے لئے الفاظ کے وضع کے طریقہ کار کے باب میں علامہ طباطبائیؒ کے نظریے کی ایک شاخ الفاظ اور اسامی کا معانی اور مسمیات میں؛ اس طرح سے استعمال ہے کہ اس لفظ کے بارے میں موضوع لہ سے ہٹ کر وہ تصورات اور خیالات جو پہلے والے استعمال کرنے والوں کے ذہن میں تھے ان کا بالکل لحاظ نہ کیا جائے بلکہ اُسی لفظ کو جدید ترکیب میں اس طرح بروئے کار لایا جائے کہ عام لوگوں کے ذہن کو ان توہمات اور خیالات سے پاک وصاف کر دیا جائے جو گذشتہ ادوار کے لوگوں کے ذہنوں میں تھے اور جو اس لفظ کی وضع اولیہ کا سبب بنے تھے۔ اس کی ایک واضح مثال قرآن مجید میں لفظ طائر ہے۔ عربی لغت میں لفظ طائر کی وضع اور استعمال کا سرچشمہ (بعض شواہد کی بناء پر) لوگوں کے درمیان ایک توہماتی فکر اور عقیدہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اسی لفظ کو لوگوں کے عقائد و نظریات کی تصحیح کے لئے استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت 13 ہمیں ارشادِ الٰہی ہے:

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا۔

یعنی: "اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کا نوشتہ اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے، اور ہم اس کے لئے قیامت کے دن (یہ) نامۂ اعمال نکالیں گے جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا "

علامہ طباطبائیؒ اس آیت کی تفسیر میں زمخشری کی زبانی مذکورہ لفظ طائر کی جڑ اور بنیاد کے بارے میں کہتے ہیں:

"وہ (عصر جاہلیت کے لوگ) پرندوں کے ذریعے فال نکالتے تھے پس جب وہ سفر کا ارادہ کرتے اور پرندہ ان کے سر سے گذرتا تو وہ پرندے کو بھگاتے اگر وہ ان کی بائیں طرف سے دائیں طرف پرواز کرتا تو اسے فال نیک (باعثِ برکت) شمار کرتے اور اگر دائیں طرف سے بائیں طرف پرواز کرتا اسے فال بد (بدشگونی) کے طور پر لیتے تھے اور اس قسم کی فال لینے کو "تطیر" کہتے تھے (یعنی پرندے کی پرواز کے ذریعے فال نکالنا)۔" (17)

لفظ طائر اسی مادہ (تطیر) سے مشتق ہے عربی زبان میں عمومی استعمال میں ہر منحوس اور بدشگون چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے اگرچہ پرندے کا اڑنا وغیرہ کا عمل دخل نہ بھی ہو، اور بعض اوقات تو اس لفظ کے استعمال میں اس (خاص جہت سے پرندے کے اڑنے کی بدبختی) کا لحاظ نہ بھی کیا جائے تو بھی اس کا اصلی معنی اور استعمال (ایک چیز کی نحوست اور بدبختی) ہر حال میں محفوظ رہتا ہے۔

اس بناء پر اگرچہ اس لفظ کا سرچشمہ اور پیدائش کی وجہ دور جاہلیت کا ایک غلط عقیدہ تھا، لیکن مذکورہ لفظ میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ اسے دورِ جاہلیت کے غلط عقیدہ سے پاک وصاف معنی میں بروئے کار لایا جائے یہاں تک کہ ان الفاظ کو انسانوں کے عقائد کو درست کرنے کے لئے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ (18) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے واضح اور رسا انداز سے اسی لفظ کو لوگوں کے درمیان رائج غلط افکار اور باطل نظریات کی تصحیح کے لئے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا انبیاء الٰہی کے مدمقابل طرز عمل کو قرآن یوں بیان فرماتا ہے:

فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُواْ لَنَا هَذِهِ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُواْ بِمُوسَى وَمَن مَّعَهُ أَلاَ إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لاَ يَعْلَمُونَ (اعراف:131)

یعنی : "پھر جب انہیں آسائش پہنچتی تو کہتے : یہ ہماری اپنی وجہ سے ہے۔ اور اگر انہیں سختی پہنچتی، وہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے (ایمان والے) ساتھیوں کی نسبت بدشگونی کرتے، خبردار! ان کا شگون (یعنی شامتِ اَعمال) تو اللہ ہی کے پاس ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ علم نہیں رکھتے"

اس آیت مجیدہ میں طائر کے معنی کے متعلق علامہ طباطبائی بیان کرتے ہیں :

طائر (بدشگون چیز) سے مراد یہاں پر انسان کا عمل ہے اس استعمال میں انسان کے (گناہ آلود) عمل کو پرندے سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اس سے (عام لوگ اپنے باطل اور غلط نظریات کی بنیاد پر) نیک فال یا بدفال نکالتے تھے اور اس لفظ کو یہ نام دینے کی وجہ یہ تھی کہ اگر پرندہ دائیں طرف سے پرواز کرتا تو اسے بابرکت سمجھتے اور خیال کرتے کہ وہ شخص اپنے مقصد کو پالے گا اور اگر بائیں طرف سے پرواز کرتا تو اُسے فال بد حساب کرتے اور خیال کرتے کہ وہ شخص اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ پائے گا۔(19)

آیت کے آخری جملے "أَلاَ إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللّهِ" میں طائر کا اصلی معنی (کسی چیز کی نحوست اور بدشگونی) محفوظ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ کے ذریعے ان کی غلط فکر اور باطل عقیدے (حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں بدشگونی) کا مقابلہ کیا ہے اور اس صحیح عقیدے اور سوچ کو ان کے ذہنوں میں ڈالا ہے کہ حقیقت میں بدشگونی، نحوست اور بدقسمتی وغیرہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کا نتیجہ ہے نہ کہ لوگوں کے درمیان ولی خدا کی موجودگی۔ پس اس مصیبت، مشکلات اور بدنصیبی کے ذمہ دار وہ خود ہیں چنانچہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں اس کا اصلی معنی (بدشگونی) اپنی جگہ پر باقی ہے البتہ اس کے مناسب اور موقع و محل پر استعمال کے ذریعے اصلی معنی کو محفوظ رکھتے ہوئے عوام کی غلط سوچ وفکر کی اصلاح کی گئی ہے جدید استعمال میں اس لفظ کی وضع کی وجہ اور عصر نزول میں موجود خرافات کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی مدّ نظر رہنا چاہیے کہ جو چیز لفظ کو جان دیتی ہے اور مفاہیم کے پیکر میں ایک عضو کی مانند زندہ رہتی ہے اور اسے نئے پیغام میں تبدیل کردیتی ہے وہ الفاظ کا چناؤ اور ان کی ترکیب ہے۔ یہ مؤلف کی گفتگو یا تحریر کا کمال ہوتا ہے کہ وہ ایک زبان کے معنی کی اکائیوں (مفردات) سے بلند و بالا محل بنادے کہ اس کے مقابلے میں انسانوں کی بنائی بلند و بالا عمارتیں ایک جھونپڑی کی طرح نظر آئیں اور ایک زبان کے اجزاء سے جدید سخن تخلیق کرکے اُسے نیا لباس پہنادے جو دیگر بشری صنعتوں سے منفرد اور جدا ہو۔(20)

بناء برایں ایک مفسر کو تفسیر قرآن میں اس نکتہ کو مدّ نظر رکھنا چاہیے کہ یہ الفاظ اس زمانے کے خرافاتی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے بلکہ قرآنی استعمالات میں ان الفاظ سے وہ معانی مراد لئے گئے ہیں جو حقائق کے بالکل مطابق ہیں اور خرافات وتوہمات کو دور کرنے میں ان کا کافی کردار ہے۔ پس مذکورہ وضاحت سے اس نظریے کی قلعی کھل جاتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ قرآن میں اس طرح کے الفاظ کا استعمال مجاز اور عصر جاہلیت کے خرافاتی اور توہماتی ماحول کے ساتھ سازگار اور ہم آہنگ ہے۔(21)

## 2۔ قرآنی الفاظ کے مصادیق کی بلندی

نزول قرآن کے مقاصد میں سے ایک لوگوں کو عالی ترین حقائق سے آگاہ کرنا ہے اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق حقائق، عالم آخرت، دنیاوی زندگی کا دوسرا رخ، دنیا و آخرت کا آپس میں تعلق اور رابطہ اور دیگر حقیقتیں جنہیں قرآن کی زبان میں غیب کے نام سے یاد کیا گیا ہے جن تک انسان کی رسائی وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔(22) دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اعلیٰ وارفع پیغام کو پہنچانے کے لئے انہی الفاظ اور کلمات سے استفادہ کیا ہے جو بنی آدم کے درمیان متداول اور رائج تھے جبکہ یہ الفاظ زیادہ تر ان مادی مصادیق کے لئے وضع (بنائے) کئے گئے تھے جن سے روزمرہ زندگی میں انسان کا سروکار رہتا تھا۔ ان الفاظ کے مادی مصادیق کے ساتھ انسان کا اُنس سبب بنتا ہے کہ ان الفاظ کے سننے سے اگرچہ وہ آسمانی کتاب سے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے مادی یا سطحی اور رائج معانی ہی ذہن میں آتے ہیں اور اس بات سے غافل ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اعلیٰ وارفع معانی اور

حقائق کو بیان فرمارہا ہے جو ان مصادیق سے بلند و بالا ہیں جن سے مادی زندگی میں ہمارا سروکار رہتا ہے۔ مذکورہ اصول اور نکتہ پر توجہ قرآن کے بہت سے الفاظ کے معانی اور قرآنی تعلیمات کو سمجھنے میں ہمیں کج فہمی اور انحراف سے بچاتی ہے۔ علامہ طباطبائی اس اصول سے متعلق گفتگو میں لکھتے ہیں۔ الفاظ کے مادی مصادیق (جو کہ الفاظ کے مصادیق اوّلیہ ہی ہوتے ہیں) سے اُنس وعادت باعث بنتی ہے کہ ان الفاظ کے سننے سے مادہ سے مربوط مادی معانی ہی ذہن میں خطور کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک ہماری دنیوی حیات باقی ہے ہمارا جسم اور قوتیں مادی امور سے سروکار رکھتے ہیں پس جب ہم حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، کلام، ارادہ، رضا وغضب، خلق اور امر جیسے الفاظ سنتے ہیں تو ان الفاظ کے مادی وجود ہمارے ذہنوں میں خطور کرتے ہیں۔

اسی طرح جب آسمان، زمین، لوح، قلم، عرش، کرسی، فرشتے اور ان کے پَر اور ان جیسے دیگر الفاظ ہمارے کانوں سے ٹکراتے ہیں تو ان کے مادی اور طبیعی وجود کے معانی اور مفاہیم ہمارے ذہنوں میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال جیسے خلقت، علم، ارادہ، مشیت کے حوالے سے بھی یہی مشکل پیش آتی ہے۔ (23)

علامہ طباطبائی اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے خبردار کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ابتدائی مصادیق (جو کہ غالباً مادی مصادیق ہیں) کو دیکھتے ہوئے مفسرین کی سوچ وفکر ان کے اصلی معانی اور مراد متکلم (جو کہ اکثر عام اور رائج مصادیق سے بلند و بالا ہوتی ہے) سے دور نہ ہو جائے۔

یہاں پر اس نکتہ کی یاد دہانی کرانا بہت ہی مناسب ہے کہ ایک لفظ کا اس کے مصداق پر منطبق کرنے کا معیار مصداق کا غرض وغایت پر مشتمل ہونا ہے نہ کہ ایک ہی صورت پر جمود، لیکن ہمارا اُنس اور عادت ہمیں اس محکم معیار پر چلنے میں ہمارے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے اور یہی بات موجب بنی کہ اہل حدیث میں سے حشویہ اور مجسمہ فرقوں نے آیات قرآن کے ظواہر پر ہی اصرار کیا اور ان سے ظاہری معانی ہی مراد لیے درحقیقت یہ ظواہر الفاظ پر جمود نہیں تھا، بلکہ مصادیق کی تشخیص میں عادت اور اُنس پر جمود تھا۔ اس نکتے کی طرف توجہ اسی طرح کے الفاظ خصوصاً اللہ تعالیٰ کی صفات کو سمجھنے میں بہت زیادہ مددگار ہے۔ (24)

اس اصول کی طرف توجہ فہم قرآن کو سمجھنے میں لغزشوں سے بچنے کے لئے چند قواعد کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ ان قواعد میں سے ایک یہ ہے:
تفسیر قرآن میں سطحی نگاہ سے اجتناب اور آیات قرآن کے بلند واعلیٰ مصادیق کی طرف توجہ کا ضروری ہونا۔" جسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

**قرآنی تعلیمات کے اعلیٰ وارفع ہونے پر توجہ اور سطحی نگاہ سے اجتناب:**

مذکورہ اصول یعنی قرآنی تعلیمات کی بلندی اور اکثر افراد کا ذہنی طور پر مادی اور محسوس (25) مصادیق سے مانوس ہونے سے جو قواعد حاصل ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور مطالب کے بلند واعلیٰ ہونے پر توجہ لازمی ہے اور عام اور سادہ معانی پر تکیہ کرنے، سادہ اندیشی اور معمولی معانی پر تطبیق کرنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے، جن کا ابتدائی طور پر مخاطب کے ذہن میں آنا ممکن ہے۔ ہمیں جاننا چاہیے کہ قرآن کی تعلیمات اور بیانات خصوصاً جب وہ صفات الٰہیہ اور کائنات کے دیگر غیبی حقائق کو بیان کر رہا ہو، انتہائی بلندیوں کی حامل ہیں اور ممکن ہے ان لوگوں کے لئے جو قرآنی تعلیمات کی نوعیت سے واقف نہیں ہیں، ان کا سمجھنا دشوار ہو۔ اس حقیقت کی طرف توجہ اور مذکورہ قاعدے کی پابندی ہمیں قرآن کے الفاظ کی تفسیر اور تشریح میں جلد بازی سے بچا سکتی ہے اور قرآن کے عالی مفاہیم کو ہماری نظروں میں محکم واستوار مقام پر قرار دے سکتی ہے۔

مذکورہ قاعدہ علامہؒ کے اصول میں تجزیہ وتحلیل کے علاوہ، آیات قرآن میں غور وفکر کے ذریعے بھی حاصل ہوتا ہے: اس بارے میں علامہ طباطبائیؒ کہتے ہیں:

قرآن کی آیات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ معانی قرآن کو سمجھنے میں اپنی عادات اور اُنس پر بھروسہ واعتماد ہمیں آیات قرآنی کے اصلی مقاصد سے دور کرتا ہے اور سمجھنے کے عمل میں خلل پیدا کرتا ہے، جیسا کہ یہ آیات: ارشاد خداوندی ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ۔ (شوریٰ:۱۱)

یعنی : "اس کی کوئی مثل ومثال نہیں ہے اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ۔ (انعام:۱۰۳)

ترجمہ : "آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتیں لیکن وہ دیکھتا ہے اور وہ موجودات کے اندر ظرافتوں سے آگاہ اور جاننے والا ہے۔"

یہ حقیقت (مذکورہ قاعدے کا خیال رکھتے ہوئے) لوگوں کو پیغام دے رہی ہے کہ آیات کے معانی اور مفاہیم کو سمجھنے کے لئے عام فہم اور اپنے مانوس مصادیق پر اکتفانہ کرو؛ بلکہ آیت کے معانی کو جاننے کے لئے اور ان کے مصادیق کی تشخیص کے لئے قرآنی تعلیمات کا ہی سہارا لو اور قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے کرو۔(26)

### ۳۔ مفردات قرآن کا عام اور مروجہ استعمال سے فرق:

قرآن کے اعتبار سے اس کے بعض الفاظ کا استعمال نہ صرف ان کے مروجہ اور عام استعمال سے فرق کرتا ہے بلکہ دینداروں کے ہاں رائج استعمال سے بھی متفاوت ہوتا ہے۔ کیونکہ دینداروں کے ہاں استعمال میں بہت سے زبان اور ماحول کے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن قرآن مجید نے اپنے اہداف کو مدّ نظر رکھتے ہوئے لفظ کو خاص مصداق اور مفہوم میں بروئے کار لایا ہوتا ہے۔ اسی طرح کی مثالیں قرآن میں بہت پائی جاتی ہیں۔

مثلاً معصیت کا لفظ دینداروں کے ہاں "امر مولوی" کی نافرمانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کی زبان میں یہی لفظ امر مولوی کے علاوہ (امر ارشادی) سے سرکشی کے لئے بھی بروئے کار لایا گیا ہے۔(27) اسی طرح لفظ "مغفرت" متشرعین کے ہاں جس معنی میں استعمال ہوتا ہے، قرآن میں اس کے برخلاف غیر گناہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔(28) "شاکرین" کے لفظ سے دینداروں کے ہاں عام معنی کے لئے استفادہ ہوتا ہے جبکہ قرآن کی زبان میں اس کا اطلاق صرف مخلصین پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ افراد جنہیں ابلیس کسی صورت میں بھی نہیں بہکا سکتا اور وہ کبھی بھی غفلت کا شکار نہیں ہوتے۔(29) اس کی ایک اور مثال "الّذین آمنوا" ہے متشرعین کی زبان میں اس سے عام معنی ذہن میں آتا ہے، لیکن قرآن کی نظر میں یہ ایک اعزازی نام ہے، صدر اسلام کے ان مومنین کے لئے جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لے کر آئے۔ پس اگر اس کے عام معنی پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو اس سے مراد وہی خاص معنی (صدر اسلام کے ابتدائی اسلام لانے والے) ہی ہوگا(30) لفظ "تفقہ" بھی اسی قبیل سے ہے یہ لفظ دینداروں کے ہاں احکام شرعی کے استنباط کرنے کی صلاحیت واہلیت کے میں معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن قرآن کی اصطلاح میں یہ وسیع معنی رکھتا ہے اور دینی تعلیمات اعم از اصول اور فروع' کے سیکھنے اور حاصل کرنے کے لئے بروئے کار لایا گیا ہے۔(31) اس کا ایک اور نمونہ لفظ زکوۃ ہے جو دینداروں کے نزدیک ایک خاص فقہی معنی رکھتا ہے، جبکہ قرآن میں اپنے لغوی (انفاق۔ خرچ کرنے) کے معنوں میں نیز استعمال ہوا ہے خصوصاً جب یہ نماز کے ساتھ مذکور نہ ہو۔(32) اسی طرح بہت ساری اور مثالیں بھی تفسیر المیزان سے پیش کی جاسکتی ہیں جنہیں یہاں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

### 3.1 قرآن کی زبان اور اصلاح پر توجہ کی ضرورت اور عمومی فہم پر بھروسہ کرنے سے گریز

اس نکتے پر توجہ ہمیں مفردات قرآن کے فہم اور تفسیر کے بارے میں ایک اور قاعدے کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے مصادیق کو معین اور مشخص کرنے کے لئے ہمیں ان کے عمومی استعمالات اور مفاہیم پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ خود قرآن کی زبان میں وہ کس معنی اور مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے اور آیت میں موجود کلامی قرائن کس معنی پر دلالت کر رہے ہیں۔ اس بارے میں علامہ

طباطبائیؒ تحریر کرتے ہیں۔ کلام الٰہی میں موجود کلمات اور الفاظ کے مصادیق کو مشخص اور معین کرنے کا راستہ خود قرآن میں موجود کلامی قرائن کی طرف رجوع کرنا ہے نہ کہ عمومی طور پر ان کے مروجہ مصادیق کی طرف رجوع کرنا۔(33)

اس بارے میں ایک مثال لفظ "روح" کی ہے۔ عرف عام اس لفظ کے متعدد اور متفاوت استعمالات ہیں (جیسا کہ المیزان کے منصف نے تذکرہ کیا ہے) لیکن قرآن کی زبان میں یہ حقیقت واحدہ کا نام ہے جس کے مختلف مراتب اور درجات ہیں ان میں ایک درجہ اور مرتبہ وہ واسطہ ہے جو اللہ تعالٰی کی طرف سے اپنے پیغمبروں کے مقام و منزلت کی تائید کے لئے ہے اسی طرح کی دیگر مثالیں بھی مل سکتی ہیں مثلاً "رؤیا" عربوں کے ہاں عام طور پر ایسی چیزوں پر اطلاق ہوتا ہے جو انسان خواب میں دیکھتا ہے، لیکن قرآن اور روایات کی زبان میں خواب سے اعم معنی پر اطلاق ہوتا ہے اور عرفانی مکاشفات، انبیاء اور اولیاء الٰہی کے خاص مشاہدات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔(34) قرآن کی اصلاح میں "قلب" سے مراد انسان کے باطنی جذبات اور ادراکات کا مرکز ہے جیسے محبت، نفرت، امید، تمنا، قضاء اور حکم۔(35) شہدا کا لفظ قیامت کے دن اعمال کے گواہوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔(36) نعمت ولایت الٰہی کے معنی میں، (37) اور "ساعت" قیامت کے معنی میں آیا ہے۔(38) اسلام نہ فقط آخری آسمانی دین کے معنی میں آیا ہے بلکہ بطور مطلق تمام توحیدی ادیان (39) کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔امام (40)، ایمان (41)، دین (42)، مشرک (43)، طعام (44)، نسخ (45)، اور ان جیسے دیگر الفاظ جن معنوں میں قرآن میں استعمال ہوئے ہیں وہ عام اور متعارف معنوں سے مختلف ہیں۔

مذکورہ قاعدے پر توجہ سے ہمیں یہ بات آسانی سے سمجھ آجاتی ہے کہ علامہؒ نے مفردات راغب سے بہت زیادہ استفادہ کیوں کیا ہے اور المیزان کے لغوی مصادر کے بارے میں بعض سوالات کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ شاید یہ سوال المیزان سے سروکار رکھنے والے بہت سارے افراد کے ذہنوں میں پیدا ہو کہ لغت کے اصلی مصادر العین، لسان العرب اور معجم مقاییس اللغۃ کے ہوتے ہوئے المیزان کے مصنف نے قرآن کے الفاظ کے معانی بیان کرتے ہوئے ہر لغوی منبع اور مصدر سے زیادہ مفردات راغب سے کیوں استدلال واستناد کیا ہے۔ شاید اس کا راز یہ ہو کہ راغب اصفہانی نے قرآن کے الفاظ کے معانی کو اخذ اور بیان کرتے ہوئے اس کی قرآنی استعمالات اور آیت میں موجود قرائن پر خاص توجہ دی ہے(46) اور یہ طریقہ کار اس قاعدے سے ہم آہنگ ہے، جس پر قرآن کے معانی اخذ کرنے کے لئے علامہ طباطبائیؒ تاکید کرتے ہیں۔ بنا بر ایں راغب کے اقوال سے بہت زیادہ استدلال کرنے کی ایک واضح اور محکم دلیل ہے کیونکہ اس نے قرآن کے مفردات کے معانی بیان کرنے میں تحقیق کی ہے۔ البتہ بعض مقامات پر اس قاعدے کی تطبیق میں وہ لغزش کا شکار بھی ہوئے ہیں وہاں پر علامہ نے ان پر اعتراض کیا ہے اور اپنے اختیار کردہ معنی کو پیش کیا ہے(47)

### 3.2 اعتبارات شرعی پر توجہ کی ضرورت

مذکورہ اصول سے ایک اور قاعدہ اخذ ہوتا ہے اور وہ حقائق شرعی پر توجہ کی ضرورت ہے علامہ کے بقول قرآن کے بعض الفاظ ایک خاص شرعی اعتبار کے حامل ہیں، اس معنی میں کہ دوسری آیات یا معتبر روایات نے اسی لفظ کی مکمل تعریف کی ہے اور اس کے معنی کی حدود و قیود کو مشخص کیا ہے ۔لہٰذا اس سے کوئی اور معنی مراد لینا قرینہ صارفہ کا محتاج ہے۔ ایسے مقامات پر عرف لغوی کی طرف رجوع کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ اس میں وہ معنی معیار ہے جسے شریعت مقدس (کتاب یا سنت) نے اس لفظ کے لئے مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی زبان میں "ابن" کے لفظ کا۔ فقط۔ پوتے پر اطلاق نہیں ہوتا بلکہ بیٹی کے بیٹے (نواسے) پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ ان مقامات پر جہاں قرآن کی واضح اور معین اصطلاح ہے، عرف لغوی کی طرف رجوع کرنا لغوی بحثوں کو معنی کی بحثوں سے غلط ملط کرنے والی بات ہو گی۔ اس بارے میں علامہ لکھتے ہیں:

"اس قسم کے الفاظ (اہل بیت، قُربا وغیرہ) کے بارے میں، ان کے شرعی اعتبار پر توجہ کیے بغیر مفسرین غالباً ان الفاظ کے لغوی مفاہیم کی طرف رجوع کرتے ہیں اس کی مثال ابن کے معنی کو مشخص کرنے کے لئے عرف لغوی کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ کہ کیا یہ لفظ بیٹی کے

فرزند کو بھی شامل کرتا ہے یا نہیں۔ یہ بات لفظی بحث کو معنی کی بحث سے مخلوط کرنے اور معاشرتی آراء کو آسمانی دین کی آراء سے غلط ملط کرنے کے مترادف ہے۔(48)"

قرآن کی زبان میں بھی بعض الفاظ کے خاص معنی میں کثرت استعمال سے بقول علامہ اس معنی میں وہ الفاظ حقیقت ثانوی اختیار کر گئے ہیں اور ان کے متعلق حقیقت شرعیہ یا حقیقت متشرعہ کی اصطلاح صادق آتی ہے ان مقامات پر بھی لغوی معنی کی طرف رجوع جائز نہیں ہے اس کی مثالیں، حج، صلوٰۃ اور صوم جیسے الفاظ ہیں(49) جو کہ نزول قرآن کے زمانے میں خاص معنوں میں کثرت استعمال کی وجہ سے ان معنوں میں مشہور ہو گئے اس لحاظ سے حقیقت شرعیہ یا متشرعیہ کے وقوع پذیر ہونے کے بعد ان سے قرینہ صارفہ کے بغیر لغوی معنی مراد لینا قطعاً جائز نہیں ہے۔ اس بارے میں علامہ بیان کرتے ہیں:

"صلوٰۃ، صوم، زکات(50)، حج اور تمتع وغیرہ جیسے الفاظ شرعی موضوعات ہیں جو عصر نزول میں کثرت استعمال کی وجہ سے اپنے خاص معنوں سے پہچانے جاتے ہیں، لہٰذا حقیقت شرعیہ یا متشرعیہ کے تحقق پانے کے بعد، اس قسم کے الفاظ جو قرآن میں استعمال ہوتے ہیں، ان سے ان کے لغوی اور اصلی معانی مراد نہیں لیے جا سکتے(51) "

**4۔وقت گزرنے کے ساتھ الفاظ کے رائج معانی میں تبدیلی:**

زبان ایک جاری حقیقت ہے جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ان تبدیلیوں میں سے ایک کلمات کے معانی میں تغییر (تبدیلی) ہے، دوسری ثقافتوں (52) سے اختلاط، عوامی رنگ اور کلمات کے دقیق معانی میں سہل انگاری، وہ عوامل ہیں جو ایک زبان کے الفاظ میں تغیر و تبدل کا موجب بنتے ہیں۔ قرآن کے بھی بہت سارے الفاظ اس آفت سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ قرآن کے بعض الفاظ کے معانی عصر نزول میں (متصل یا منفصل قرائن کی مدد سے) پورے طور پر واضح تھے لیکن مذکورہ عوامل کی وجہ سے تغیر و تبدل سے دوچار ہو گئے اور عصر نزول کے معانی سے بہت دور ہو گئے اس کی مثال امامت کا لفظ ہے جو قرآن میں بعض جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ علامہ طباطبائی سورہ بقرہ کی آیت 124 میں اس لفظ کے معنی کے متعلق لکھتے ہیں:

سورہ بقرہ کی آیت نمبرآیت نمبر124 "إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا" میں امامت کی تفسیر بعض مفسرین نے نبوت، پیشوائی اور مطاع ہونے سے کی ہے اور بعض نے اس کی تفسیر خلافت و وصایت یا دینی یا دنیاوی امور میں سربراہی بیان کی ہے۔ اس قسم کی تفسیروں کی وجہ سے ہے قرآن کریم کے الفاظ کے معنی کثرت استعمال اور وقت گزرنے کے ساتھ لوگوں کی نظروں میں (اپنے اصلی مقام و منزل سے) نیچے آ گئے ہیں(53) حالانکہ یہ الٰہی نعمت (آیت میں مذکور امامت) لفظی مفاہیم میں محصور نہیں ہو سکتی اور عام لوگوں کی دسترس میں نہیں آ سکتی، بلکہ یہ اپنے اندر حقیقی تعلیمات کے حقائق لئے ہوئے ہے۔ لفظ امامت ان حقائق کے ماوراء ایک حقیقت کا حامل ہے۔(54)

البتہ ممکن ہے کہ قرآن میں ایک لفظ کئی مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہو اور لفظ امام اسی قبیل سے ہے یہ لفظ اپنے خاص قدسی(55) معنی کے علاوہ ظلم و جور اور کفر کے پیشواؤں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔(56) بہر حال ایک لفظ کا عرف عام میں مکرر ایک معنی میں استعمال اس بات کا باعث نہ بنے کہ اس کے قرآنی استعمالات میں غور و فکر سے ہاتھ اٹھا لیا جائے۔ بلکہ قرآن کے ہر لفظ کے ترجمہ و تفسیر میں پیش نظر آیت میں اس لفظ کے خاص قرائن پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔

اس کا ایک اور نمونہ اُمّت کا لفظ ہے اس کا اطلاق دین اسلام پر عقیدہ رکھنے والے تمام افراد پر ہوتا ہے اس کا یہ معنی نزول قرآن اور دعوت اسلام کے پھیلنے کے بعد کی پیداوار ہے، لیکن اس کا اصلی معنی اور اس کا دائرہ کار اس کے استعمال اور موجود قرائن کے تابع ہے۔(57) اس کے علاوہ دیگر بہت سی مثالیں ہیں جن کا ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔(58)

**عصر نزول میں مروجہ استعمال کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت**

جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معانی میں تغیر و تبدل اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض الفاظ عصر نزول میں مروجہ معانی سے دور ہوگئے ہیں۔اس حقیقت کی طرف توجہ ہمیں دور حاضر کی لغات کی کتب اور ڈکشنریوں پر اعتماد کرنے سے روکتی ہے کیونکہ ان کا کام صرف عربی زبان کے الفاظ کے عصر حاضر میں رائج معانی اور استعمال کو بیان کرنا ہے۔ یہ امر (عصر نزول میں ہر لفظ کے معانی اور استعمالات سے آگاہی کے لئے) قدیم معتبر لغوی مصادر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کو آشکار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر طعام کا لفظ آجکل ہر قسم کی خوراک اور غذا کے لئے استعمال ہوتا ہے (چاہے وہ گوشت ہو یا غیر گوشت) لیکن (علامہ کی تحقیق کے مطابق) یہ لفظ عصر نزول میں حبوبات (غلّہ جات یعنی دانوں والی غذا) کے لئے بروئے کار لایا جاتا تھا لہٰذا اس کی تفسیر کرتے ہوئے اسی عصر نزول والے معنی پر منطبق کیا جائے۔(59)

**5۔ نئی زبان میں داخل ہونے سے غیر عربی الفاظ کے معانی میں تبدیلی:**

طبیعی طور پر عربی زبان نے دیگر زبانوں اور ثقافتوں کے ملنے سے بہت سارے الفاظ کو ان سے لیا ہے اور انہیں اپنے اندر جگہ دی ہے۔ان میں سے بعض الفاظ نے عربی زبان میں نیا رنگ روپ دھار لیا ہے، نئی شکل وصورت بلکہ نئے معانی کے ساتھ اپنی زندگی کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔علامہ طباطبائی کی رائے ہے کہ اس طرح کے دخیل الفاظ کے نمونے قرآن مجید میں بھی پائے جاتے ہیں۔(60)قرآن میں غیر عربی الفاظ کو سمجھنے اور ان کی تفسیر کے بارے میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کی تفسیر عربی زبان کے قبول شدہ معیاروں پر کی جائے اور انہیں عربوں میں رائج فہم وادراک پر منطبق کیا جائے۔ان الفاظ کے اپنی پہلی اور اصلی زبان میں معانی پر تکیہ کرنا بعض اوقات ہمیں عربی زبان میں ان کے رائج اور مستعمل معانی سے دور کر دیتا ہے۔

**عربی زبان میں داخل ہونے والے الفاظ کے عربی زبان میں معانی پر توجہ کی ضرورت:**

اس نکتے کی طرف توجہ انتہائی ضروری ہے خصوصاً قرآن میں، جو کہ فصیح ترین اور بلیغ ترین کلام ہے اور اپنے مقاصد کو واضح اور بہترین انداز میں بیان کرتا ہے۔قرآن مجید میں اس قسم کے الفاظ کی ایک مثال سورہ نحل کی آیت نمبر۶۷ ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

وَمِن ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا

ترجمہ: "اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم شکّر اور (دیگر) عمدہ غذائیں بناتے ہو"

بعض مفسرین نے ابن عباسؓ کے قول سے استدلال کرتے ہوئے اس لفظ "سَكَرً" کا ایسا معنی کیا ہے جو عربی زبان میں رائج نہیں ہے۔اس کے متعلق علامہ طباطبائی بیان کرتے ہیں:

"جو کچھ مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے اس لفظ کا حبشی زبان میں معنی سرکہ ہے یہ معنی نا قابل اعتناء ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ قرآن میں استعمال ہونے والے غیر عربی الفاظ کی تعداد کم نہیں ہے (جیسا کہ استبرق، جہنم وزقوم اور دیگر الفاظ کے بارے میں کہا گیا ہے) لیکن یہ اس صورت میں ہے جب ان کے استعمال سے اشتباہ اور ابہام پیدا نہ ہو چنانچہ "سَكَرً" جیسے لفظ کا استعمال جس کا عربی زبان میں خمر (شراب) معنی ہے اور حبشی زبان میں سرکہ کے معنی میں ہے، دوسرے معنی میں جائز نہیں ہے، کس طرح ممکن ہے کہ قرآن جو کہ بلیغ ترین کلام ہے، لفظ خلّ جو فصیح عربی اور مراد کو بطور کامل پہنچانے والا ہے، کو چھوڑ کر سرکہ کے معنی کو بیان کرنے کے لئے حبشی زبان کے لفظ سَكَرً کا انتخاب کرے جو سرکہ کا معنی دیتا ہے اور عربی زبان میں اس کا متضاد "شراب" بھی موجود ہو؟(61)

اس ضابطے کے مطابق لفظ سَکَرً اور قرآن میں اس طرح کے دیگر الفاظ کا وہی معنی اور تفسیر کی جائے جو عربی زبان میں فصیح اور رائج ہو۔ اگرچہ یہ الفاظ اصل میں دوسری زبانوں سے عربی زبان میں داخل ہی کیوں نہ ہوئے ہوں اور اصلی زبان میں کسی اور معنی میں استعمال ہوتے ہوں۔

## نتائج:

تفسیر کے باب میں الفاظ قرآن کے فہم وادراک کی کیفیت چند قواعد وضوابط کے تابع ہے اور خاص اصولوں پر استوار ہے۔ تفسیر المیزان کی عبارات میں تحقیق یہ بتاتی ہے کہ علامہ طباطبائی نے اصول وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے خاص بنیادوں پر اور خاص قواعد کے تحت قرآن کے الفاظ کے معانی بیان کیے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ مفردات قرآن کے مصادیق کی خصوصیات ان کے موضوع لہ سے خارج ہیں یہ امر ایک لفظ کی حقیقت کو مختلف مصادیق (اس کے استعمال اور استفادہ کے ساتھ) پر منطبق کرنے کی قابلیت عطا کرتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں، سراج، سلاح اور میزان کے الفاظ ہیں جو حقیقت میں وقت کے گزرنے کے ساتھ مختلف مصادیق پر قابل اطلاق ہیں۔ اس اصول (جس کی تائید میں بہت سارے شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں) کی روشنی میں ان آراء کی کوئی اہمیت نہیں رہتی جو مصادیق کی خصوصیات کو مسمیات میں دخیل قرار دیتی ہیں اور سائنسی وعلمی نظریات کو الفاظ قرآن کے فہم وادراک میں مؤثر قرار دیتی ہیں۔

۲۔ اگرچہ دوران جاہلیت کے عربوں کے درمیان رائج بعض الفاظ کا سرچشمہ اس کے دور کے باطل نظریات اور غلط عقائد تھے، لیکن ان الفاظ کو مناسب ترکیب میں استعمال کرکے انہی الفاظ کو باطل اور غلط عقائد کی تصحیح کے لئے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

۳۔ نزول قرآن کے مقاصد میں سے ایک مقصد لوگوں کو اعلیٰ حقائق سے آگاہی ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات، عالم آخرت، دنیاوی زندگی کا دوسرا رخ، دنیا وآخرت کا آپس میں تعلق جیسے حقائق اور اس طرح کی دیگر حقیقتیں جنہیں قرآن کی زبان میں غیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صفاتِ خدااور عالم آخرت سے مربوط آیات میں قرآن کے الفاظ زیادہ تر ماورائے مادہ اور عالی مصادیق کے لئے استعمال ہوئے ہیں؛ لہٰذا ان الفاظ کے عرف عام میں رائج مصادیق مفسر کے ذہن کو ان کے عالی اور بلند مرتبہ معانی سے منصرف کرنے کا باعث نہ بنیں۔

۴۔ عرب قوم کا دیگر اقوام سے میل ملاپ (اختلاط) اور روابط بعض الفاظ کے معنا میں تبدیلی کا سبب بنا ہے، قرآن میں اس قسم کے الفاظ کے سمجھنے کا درست اور صحیح معیار عصر نزول میں ان کے مروجہ استعمال کا حصول ہے۔

۵۔ قرآن کی اصطلاح میں بعض الفاظ کے خاص معانی پائے جاتے ہیں؛ معصیت، مغفرت شاکرین، تفقہ، زکات، قلب، نعمت اور ولایت جیسے الفاظ کا تعلق اسی قبیل سے ہے، یہ چیز تفسیر میں مدّ نظر رہنی چاہیے۔

۶۔ دیگر اقوام کے ماحول اور ثقافت کا عربوں کے قریب آنے سے دوسری زبانوں کے الفاظ عربی زبان میں داخل ہوئے ہیں۔ غالباً ان الفاظ نے عربی زبان میں نئے معانی زیب تن کیے ہیں اور انہوں نے نیا رنگ روپ اختیار کیا ہے اس قسم کے الفاظ (خواہ قرآن میں ہوں یا غیر قرآن میں) کے معانی کو سمجھنے کے لئے عربی زبان وادب میں ان کے استعمالات کو مدّ نظر رکھا جائے۔

*****

# حوالہ جات

---

1۔اس ،مکالے میں فہم قرآن کے بنیادی اصولوں سے مراد، قران کے بارے میں پہلے سے طے شدہ بنیادی مفروضات کا مجموعہ ہے جس پر تفسیر قرآن کا دار ومدار ہوتا ہے اور قرآن کے مفردات اور کملات کے معانی کی تہہ تل پہنچنا، ان اصولوں کی روشنی میں انجام پاتا ہے۔

2۔ دیکھئے: سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ۲، ص ۳۱۵۔

3۔ایضاً: ج ا، ص ۱۰۔

4۔مثال کے طور پر میرزا محمد بن سلیمان تنکابنی (متوفای ۱۳۰۲ھ) اس بارے میں لکھتے ہیں: اِنَّ لِکُلِّ معنی من المعانی المتضاد من الالفاظ والمبانی روحاً وحقیقتة وك ما ان له فشراً وقالباً وقد یتعدد الصور والقوالب لحقیقةٍ واحدة وانما وضعت الالفاظ فی الحقیقة للروح والحقیقة واستعمالها فی القشور والقوالب والصور لنوع اتحاد بینهما: مثلاً لفظ القلم انما وضع لآلة نقش الصور الارواح فی الالواح بلااعتبار کونه من قصب اوجدید اوخشب، بل بلااعتبار کونه جسما ولاکون اعنقوش محسوساً اومفقولاً والاکون اللوح من قرطاس اوخشب اوجدید۔۔۔۔۔وکذلك الحال فی المیزان فانه وضع یمعیار یعرف بها المقادیروهذا روحه وحقیقته ولته وصفوته وله قوالب وقشور بعفها جسمانی وبعض روحانی۔۔۔" المیرزا محمد بن سلیمان التکابنی، توشیح التفسیرفی قواعد التفسیروالتاویل، تحقیق: شیخ جعفر السعیدی الجبلانی، ص ۳۴-۳۳۔

5۔ بطور مثال (دیکھیں: سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ا، ص ۱۰/ج ۱۴، ص ۱۲۹-۱۳۰/ج ۱۷، ص ۷/ج ۱۳، ص ۵۴

6۔ دیکھیں: ایضاً، ج ۲، ص ۳۲۰-۳۱۹

7۔ دیکھیں: المیزان، ج ۱۴، ص ۱۳۰-۱۲۹

8۔ دیکھیں: المیزان، ج ۱۲، ص ۲۰

9۔الفاظ کے موضوع لہ سے مصادیق کی خصوصیات کا خارج ہونا اور پیش نظر غرض و غایت کا معیار ہونا۔

10۔ دیکھیں: سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ۲، ص ۳۱۵-۳۱۶

11۔ایضاً، ج ا، ص ۲۱

12۔ایضاً، ج ۱۴، ص ۱۳۰-۱۲۹

13۔ دیکھیں: عبدالکریم سروش، قبض وسبط تئوریک شریعت، ص ۴۶۲۔

14۔ دیکھیں: احد فراسرزقراملکی: "کتاب شناسی توصیفی تحول معرفت دینی" مجلّہ "کتاب نقد" سال دوم، ش ۵ اور ۶، ص ۳۶۲-۳۸۴۔

15۔علامہ کے نظریے کے درست ہونے کی ایک دلیل سخن کے وجود میں آنے کا فلسفہ ہے جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے سخن اور کلام معاشرتی سطح پر انسان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آیا ہے؛ جس کے نتیجے میں الفاظ اور ان کے معانی کے مدّ نظر غالباً ان اشیاء کے وہ ظاہری خواص ہوتے ہیں جو عرف عام کی نظر میں ہوتے ہیں۔اسی طرح الفاظ ومعانی کے پیش نر وہ مقاصد ہوتے ہیں جو عام طور پر ان مادی اشیاء سے حاصل ہوتے ہیں نہ کہ ان اشیاء کی ات اور نہ ہی ذات جمع تمام اوصاف اور خصوصیات۔ مثلاً عرف عام میں آگ کا لفظ ایک ایسی حقیقت کے لئے وضع کیا گیا ہے جو جلانے والی ہے اور اس کا شعلہ رنگوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور اگر کسی چیز کی خصوصیات اور اوصاف اس کے نام رکھنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں تو وہ زیادہ تر وہ ظاہری اوصاف ہوتے ہیں تو عرف عام کی نظر میں اس چیز کی حقیقت کو تشکیل دیتے ہیں نہ کسی چیز کی وہ حقیقیت جو واقع میں ہے۔مکورہ مثال میں یہ کہ گ کا شعلہ کن عناصر سے مرکب ہے، اس لفظ آگ کے استعمال میں اور نام رکھنے میں ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا ہے۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس کے مصادیق میں تغیر وتبدل کے باوجود ان الفاظ کو جدید معانی میں استعمال کرتے ہوئے کسی قسم کی مجاز گوئی کا احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر حقیقت میں کسی چیز کے حقیقی اوصاف اس کے موضوع لہ کا جزء ہوتے تو علمی نظریات میں تبدیلی الفاظ کے معانی میں تغیر وتبدل کا موجب بنتے۔کم از کم ایک خارجی حقیقت جیسے آگ یا سور میں تسلیم شدہ نظریے میں بنیادی تبدیلی کے واقع ہونے سے لوگ قدیم لفظ کے استعمال اور اس کے اُس حقیقت خارجہ پر اطلاق میں شک وتردید کا شکار ہوجائیں یا یہ کہ قدیم لفظ کو قرینے کے ساتھ یا بطور مجاز استعمال کریں۔

16۔مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: صادق لاریجانی، معرفت دینی، ص ۱۱۹-۱۲۰، رضا دینی، گزارۃ دوم؛ نقد نریہ قبض وبسط تئوریک شریعت (1) "کتاب نقد، شمارہ ۵-۶، ص ۳۱۲-۳۱۶۔

17۔ دیکھیں: سید محمد حسین طباطبائی، المیزان، ج ۱۳، ص ۵۳-۵۴، محمود بن عمر زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ذیل نمل: ۷۴، الجزء الثالث، ص ۱۷۳، راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص ۵۲۸، ذیل مادہ طیر، فخرالدین طریحی، مجمع البحرین، ج ۳، ص ۳۸۲، مادہ طیر کے ضمن میں۔

18۔مذکورہ قابلیت کے عوامل میں سے ایک، الفاظ کے اصلی موضوع لہ سے مصادیق کی خصوصیات کا خارج ہونا ہے، جس کی طرف علامہ کے "الفاظ، معانی اور ان کے مصادیق خارجیہ کے درمیان رابطہ کیفیت" کے بارے میں نظریے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

19۔ دیکھیں: سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ۱۳، ص ۵۳۔

20۔اس فرق میں راز کیا ہے اس بارے میں دیکھیں: المیزان، ج۱، ص۶۹۔

21۔اس بارے میں مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: امیر رضا اشرفی۔ "سیر اشگی قرآن لزاندیشہ ماو باورھای باطل (پژوہشی دریکی از مبانی تفسیری علامہ طباطبائی) " مجلّہ معرفت، ش۱۰۷، ص۱۸-۲۸۔

22 ۔وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (بقرہ۔۱۵۱)

23۔دیکھیں: المیزان۔ج۱،ص۹۔

24۔ایضا،ج۱،ص۱۰۔۱۱

25۔اکثر انسانوں کا محسوس اور مادی مصادیق سے ذہنی انس۔

26۔دیکھیں: المیزان۔ج۱،ص۱۰۔۱۱۔

27۔ قرآن کی زبان میں معصیت اور مغفرت ، حق سے ہر قسم کی دوری پر اطلاق کیا گیا ہے۔اس لئے مخلصین جو شیطان اور اس کے بہکاوے سے محفوظ ہوتے ہیں،کے بارے میں بھی ذنب اور مغفرت کااستعمال کیا گیا ہے۔ (دیکھیں: المیزان، ج۵، ص۲۷ اور ج۶، ص۳۷۰۔۳۷۱)

28۔ جیسا کہ یہ آیت ہے: وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (نحل: ۱۸)

29۔لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ (اعراف:۱۸۹) کی تفسیر میں علامہ اس آیت وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (اعراف:۱۷) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اَنَّ الشاکرین فی عرف القرآن هم المخلَصون(بفتح الام) الذین لاسبیل لابلیس علیهم ولا دبیب للخفلة فی قُلُوبِهِم۔ (المیزان ،ج۸، ص۳۷۶)

30۔ المیزان، ج۱، ص۲۴۶۔۲۴۷، ج۹، ص۵۲ اور ص۳۱۵اور ج۱۱، ص۵۴۔

31۔ دیکھیں: ایضاً، ج۹، ص۴۰۴۔

32۔ دیکھیں: ایضاً، ج۶، ص۱۰۔

33۔"انّ الطریق الی تشخیص مصادیق الکلمات فی کلامہ تعالیٰ هو الہ جوع الی سالر مایصلح من کلامہ لتفسیرہ دون الہ جوع الی العرف وامیراہ فی مصادیق الالفاظ" (المیزان، ج۱۲، ص۲۰۷)

34۔ چ ج۱۰، ص۱۰۱۔

35۔ ایضاً، ج۹، ص۴۶۔

36۔ ایضاً، ج۴، ص۴۰۷۔

37۔ دیکھیں تفسیر المیزان، ج۴، ص۳۰۵، ج۱۵، ص۱۵۔

38۔ ایضاً،ج۸، ص۳۷۰

39۔ایضاً ،ج ۳، ص۲۷۹

40۔ ایضاً،ج ۱۳، ص۱۶۷/و۱۶۸اور ۴۰۴

41۔ ایضاً،ج۱۵، ص۶۔

42۔ ایضاً،ج۱۲، ص۳۶۵۔

43۔ ایضاً،ج۱۲، ص۳۱۹۔

44۔ ایضاً ج۵، ص۲۱۲۔

45۔۔ایضاًج۵، ص۲۱۷۔

46۔ مفردات قرآن کے معانی بیان کرنے میں راغب اصفہانی کا اسلوب ان کی بیش قیمت کتاب پر اجمالی نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے۔اس نے بہت سے مقامات پر قرآنی الفاظ کے کسی خاص معنی کو انتخاب کرنے کے قرآن سے واضح طور پر دلائل پیش کیے ہیں۔

47۔ بطور مثال دیکھیں: ایضاً، ج۱۲، ص۳۳۱۔

48ایضاً، ج۹، ص۱۷۸۔

49 اس کی مثال تقویٰ کا قران میں محارم الٰہی سے پرہیز کے خاص معنی میں استعمال ہے۔ (دیکھیں: تفسیر المیزان؛ ج۹، ص۱۵۰۔۱۵۱)

50۔ یہ لفظ جب صلوۃ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو عام طور پر ایک مالی عبادت جس کی حدود و قیود شریعت میں مشخص میں، کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض مکی سورتوں میں جن کے نزول کے وقت زکوۃ فرض نہیں ہوئی تھی، اپنے لغوی معنی (اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے) میں استعمال ہوا ہے، جس طرح اس آیت میں زکوۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے: "وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ۔ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ" (حم سجدہ: ۶۔۷)

51۔ دیکھیں : المیزان، ج ۴، ص۲۷۲۔

---

52۔اس بارے میں ابن اثیر لکھتے ہیں: غیر مسلموں کا اسلام سے مشرف ہونے سے عربی زبان دوسری زبانوں سے مخلوط ہونے کی وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ تبدیل ہوگئی؛ کچھ الفاظ کے معانی جو عصر نزول میں لوگوں کے درمیان مشہور اور رائج تھے، وہ معانی عام عربوں کے لئے اجنبی اور انجان ہوگئے اور دن بدن الفاظ کے معانی کی غربت اور ابہام میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس اجنبیت اور ابہام کا دائرہ خواص تک پھیل گیا" (دیکھیں: ابن اثیر: النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، ص۵)

53۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ جب جملے اور الفاظ زبان زد عام ہو جائیں تو بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان کے معانی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان کے معانی میں زیادہ غور و فکر نہیں کرتے۔

54۔ دیکھیں: سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان۔ ج ۱۷، ص۳۶۱۔

55۔ دیکھیں: مذکورہ تفسیر میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ اور انبیاء کی آیت ۷۳ کی تفسیر میں۔

المیزان، ج۱، ص۲۷۱۔۲۷۲، ص

دیکھئے: سورہ بقرہ کے ذیل میں علامہ کی تفسیر ،۱۲۴ وانبیاء ۷۳۔المیزان ج۱، ص۲۷۲،۲۷۱ اور ج۱۴، ص۳۰۴۔

56۔ جیسے توبہ: ۱۱۲ اور قصص: ۴۱

57۔امت محمد کے اطلاق سے ان تمام لوگوں کا ارادہ کرنا جو آپؐ کی دعوت سے ایمان لائے، نزول قرآن اور دعوت اسلامیہ کے پھیلنے کے بعد ایک جدید استعمال ہے۔ بصورت دیگر امت کا معنی قوم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (ھود: ۴۸) کبھی کبھار واحدة پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (النحل: ۱۲۰) (دیکھیں: سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان: ج۱، ص۲۹۷)

58۔اس کی ایک مثال لفظ "استمتاع" ہے جو عصر نزول میں حقیقی طور پر نکاح متعہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لہٰذا اس کو لغوی معنی یا اس کے علاوہ کسی اور معنی پر حمل کرنا جائز نہیں ہے (دیکھیں: سید محمد حسین طباطبائی، ج۴، ص۲۷۱۔۲۷۲)

59۔ ایضاً، ج۵، ص۲۰۴۔

60۔ اس مسئلے اور اس کے اقوال کے بارے میں محققین قرآن کی آراء: دیکھیں: سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، الجزء الثانی، النوع الثامن والثلاثون، ص۱۲۵۔۱۴۳۔

61۔ دیکھیں: تفسیر المیزان، ج۱۲، ص۲۹۱۔